اسلامی مکاتبِ فکر میں اتحاد کی صورت

قاری رمضان نجم باروی☆

Abstract:

"The human nature urges to live with the differences and unity. It is not possible to by uniform in every aspect. The differences without any logic deteriorate to social life and there is dire need to become unity in common interests. However it is possible to minimize the intensity of discrepency of any discipline. The dream of unity of Muslim Ummah may by achieved by good interpretation but by a sincere struggle and It is necessary to investigate the basis of unity there is no doubt in this openion that love with the Holy Prophet (ﷺ) provides strong basis of unity among the muslims."

Keywords: Islamic schools of thought, Combination point, People of the Book, Difference of opinion, Basics of Islam.

قوتِ فہم میں اختلاف کی وجہ سے فکر ونظر کا اختلاف ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کسی بھی صاحبِ فہم وتمیز کو نہ مجالِ انکار ہے نہ راہِ فرار۔ دوسری طرف اس اختلاف رائے کو کسی نقطۂ اتحاد کی طرف لے جانا بھی علامتِ سلامتی، ضمانت نجات اور دلیل فوز وفلاح ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس اختلاف کو اتحاد میں بدلنے یا اختلاف کو باعثِ رحمت بنانے میں اخلاص وللّٰہیت کا ہونا بھی ایک نا قابل تردید حقیقت وواقعیت ہے۔ ''اِنما الاعمالُ بالنیاتِ''[1] سے اسی اخلاص نیات کی طرف راہنمائی کی گئی ہے۔ اختلافِ نظر ممنوع بھی نہیں ہے، بلکہ یہ زندگی، بیدار مغزی، قوتِ فکر، فکری جسارت، انسانی صلاحیت، حیوان ناطق کی انفرادیت اور جوہر فطرت کی قابلیت کی نشانی ہے۔ اور بسا اوقات فکری اختلاف امت کے لیے باعث خیر ویُسر اور ذریعہ سہل ورحمت بھی ثابت ہوتا ہے۔ اگر خیر اُمت لوگوں کی زندگی کو پڑھیں،

☆ پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ علوم اسلامیہ وعربی، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

سمجھیں اور اُن میں غور کریں تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ جن کی راہ، راہِ سنت قرار دی گئی ہے خود اُن میں بھی فروعی اختلاف موجود ہے، جو اس بات کی بین و ناقابل تردید دلیل ہے کہ ہر اختلاف نہ باعث فساد ہے اور نہ ہی وسیلۂ نفرت وعناد بلکہ اِن نفوسِ زکیہ وعادلہ کا اختلاف، یقیناً بعد کے لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرنے کا سبب ہے ورنہ اِن لوگوں کے لیے ''**فعلیکم بسنتی وسنّة الخلفاء الراشدین**''[۲] اور ''**النجوم امنة للسماء فاذا ذهبت النجوم أتى السماء ما توعدون وانا امنة لاصحابی فاذا ذهبت انا اتی اصحابی ما یوعدون واصحابی امنة لأمتی فاذا ذهبت اصحابی أتی امتی ما یوعدون**''[۳] کے سیم وزر سے بھی زیادہ قیمتی کلمات زبانِ صداقت سے کبھی جاری نہ ہوتے۔ البتہ ایسا اختلاف یقیناً قبیح، مذموم اور مکروہ ہے جو آسانی کے بجائے امت کے لیے حیرانی وپریشانی بلکہ قتل وغارت گری تک کا ذریعہ بن جائے۔

قرآن حکیم نے اپنا پہلا پیغام ہی ایسا مضبوط، دائمی اور ابدی دیا ہے جو تمام مشکلات سے نکلنے، تمام خوبیوں سے آراستہ ہونے اور پوری دنیا کی ترقی، خیر، کامیابی، سہولت اور سربلندی سے ہمکنار ہونے کا ضامن ہے۔ آج تک جو ترقی ہوئی ہے، جو ہوگی، جو کامیابی ہوئی ہے یا ہوگی، جو معراج انسانیت کو نصیب ہوئی ہے یا ہوگی، تو یہ سب فیضان ہے ''**اقرأ باسم ربک الذی خلق......**''[۴] کا۔ اس کے ساتھ قرآن نے اپنی ابتدائی تعلیمات میں جو ایک کامیابی وکامرانی کا نسخہ دیا ہے وہ خالق ومخلوق کے ساتھ جڑے رہنے کا، یعنی حق کو تسلیم کر لینے کا ہے چاہے وہ حق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو یا مخلوق کی طرف سے اور یہی حبل اللہ کو مضبوطی کے ساتھ تھامنے کی دلیل ہے۔[۵] امت سازی کا مدار بھی اختلاف سے نکل کر وحدت ویگانگت کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ تھام لینے پر ہے۔ اور یہ یگانگت فکر ونظر میں ہے جس پر عمل کا مدار ہے۔

قرآن اور صاحب قرآن ﷺ نے اپنی حکیمانہ طرزِ تدریس وتربیت سے زمانۂ جاہلیت کے اختلاف کو، جس کا ختم ہونا قریب ناممکن (Impossible) تھا ایسے مثالی اتحاد میں بدلا کہ اب تک اس جیسا اتحاد لاشیر سے شیر (Milk) نکالنے کے مترادف ہے۔ آپ ﷺ نے ہلاکت خیز اختلاف کو رحمت آمیز اتحاد میں بدل کر رکھ دیا اور اسی مثالی اتحاد کو جس کا سرچشمہ ذاتِ مصطفیٰ ﷺ کی ذاتِ پاک تھی، خود قرآن نے نعمت اللہ قرار دیا ہے۔[۶]

وہ لوگ جو ایک دوسرے کے خون سے اپنی سیرابی کا سامان کرتے تھے اب ایک دوسرے پر اپنا خون نچھاور کرنے کو اپنی کامیابی کا سامان سمجھنے لگے۔ یہ مثالی اخوت[۷] تاریخ انسانی میں ارض وسماء، لیل ونہار اور شمس وقمر تک نے اپنی زندگی میں کبھی نہ دیکھی تھی۔ اور غور وخوض کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اپنے رب سے تربیت پانے والی عظیم ذات ﷺ نے ان ابتدائی اسلام کے شیدائیوں کو ایک فکر اور ایک سوچ پر جمع فرمایا یعنی اتحادِ نظری کا بے مثال سبق سکھایا، تاکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد فرمودہ فرائض کے بعد

بہت سارے معاملات جو میری امت طے کرے گی اُن کی بنیاد اسی فکری و نظری یگانگت پر ہو، تو اُن کا اختلاف بھی فضول نہیں معقول اور قابل قبول ہوگا۔

حامل ختم نبوت ﷺ نے اپنی امت کو اتحاد کے ایسے اصول دیے ہیں کہ اُن کو اپنانے سے فروعی اختلافات کے باوصف اُمت متحد بھی رہ سکتی ہے۔لیکن امت میں کچھ ایسے لوگ دَر آئے ہیں جنہوں نے پیشوائی کا جھوٹا منصب سنبھال کر ایسے انفرادی نظریات پیش کیے ہیں اور اتحادِ مسلم کو ایسا پارہ پارہ کیا ہے کہ اب ان بکھرے موتیوں کو چننا اور پھر ایک لڑی میں پرونا بہت مشکل لگ رہا ہے لیکن بہرحال یہ کام کرنے کے بغیر بھی چارۂ کار نہیں ہے۔اور حقیقت امر یہ ہے کہ ایک ایسا گروہ وحدتِ مسلم کو ختم کرنے کے درپئے ہے جو شروع دن سے ہی اپنے کام پہ لگا ہوا ہے اور نسل در نسل چل رہا ہے۔ جب تک اس قدیمی دشمن کو ہمارے اربابِ حل وعقد پہچان کر اُس پہ کڑی نظر نہیں رکھیں گے اتنی دیر تک اس فتنے سے نقصان اُٹھاتے رہیں گے۔

ہمارے اسلاف میں بھی فروعی اختلاف رہا ہے لیکن کبھی کسی نے اپنی علمی تحقیق کو حرفِ آخر نہیں سمجھا بلکہ دوسرے کی تحقیق کے حق ہونے کے امکان کو بھی مدنظر رکھا ہے جس کی وجہ سے دلوں میں کدورتیں، بُعدِ قلوب اور ہتک آمیز رویے (Behaviours) جیسی برائیاں کبھی پیدا نہیں ہوئیں۔آج ہم اُنہیں کی اقتداء اور غلامی کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن ہمارے درمیان اس قدر اختلاف ہے کہ ہم عملاً اسلاف کے پیروکار نہیں رہے۔ہم نے دوسرے نظریے کے لوگوں کو دوسری دنیا کے افراد سمجھ کر نفرتوں کا ایسا خالص بیج دلوں میں بو دیا ہے کہ اب اس کی فصل تیار ہوگئی ہے۔اور پھر اسی بیج کو نسل در نسل نہ صرف آگے منتقل کیا جارہا ہے بلکہ اس کی کئی اقسام (Varieties) ایجاد کر لی گئی ہیں۔فروعی اختلافات کو ہم نے مستقل مذہب کی بنیاد بنالیا ہے اور ظلم کی انتہا یہ ہے کہ یہ سب کچھ ثواب سمجھ کر کیا جارہا ہے۔فضولیت کو معقولیت کا نام دے دیا گیا ہے اور معیارِ عقل وخرد کو ہی بدل کر رکھ دیا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ قلوب واذہان کی کج سمتی کو راہِ راست سے ہمکنار کرے۔

نقطۂ اتحاد

اسلامی مکاتب فکر میں جس چیز نے اختلاف میں شدت اور حدت پیدا کی ہے وہ ہے پیشوایانِ مذہب اور واجب التعظیم شخصیات کے بارے غیر مناسب، نامعقول، غیر محتاط اور تحریر و تقریر میں غیر سنجیدہ بلکہ بازاری اور غیر معتدل جملوں کا ناموزوں لہجے میں استعمال۔ایک قلمکار نیک نیتی کے باوجود مفہومِ بد کو متضمن جملے لکھ بیٹھتا ہے۔لیکن جب دوسرا دانش ور اسے ناقدانہ نظر سے دیکھتا ہے تو اُسے یہ جملے کفر نہیں تو قریب کفر ضرور نظر آتے ہیں۔اور چونکہ ہمارے ہاں کبھی بھی تقریر و تحریر کے قانونی واخلاقی ضابطے رائج نہیں رہے اس لیے دوسرا ناقد شخص اس کا حل صرف یہ کرتا ہے کہ اصل مجرم کو اطلاعِ جرم

دینے، اس کی اصلاح کرنے اور سمجھانے کے بجائے اُس کے جواب میں ایک ایسی کتاب لکھ مارتا ہے کہ جو تلوار سے زیادہ تیز زخم لگاتی ہے۔ اُس میں موصوف کی ذات سے لے کر ہر ہر صفت، عمل اور کردار کو ایسا نشانہ بنایا جاتا ہے کہ انسانیت کے دائرے سے نکال کر حیوان غیر ناطق کے بدترین افراد میں شمار کرتا ہے۔

اب اس کے جواب الجواب کے طور پر پہلی شخصیت بجائے اپنی عبارت پر نظر ثانی کرنے کے ''جو چند جملوں یا چند سطروں پر مشتمل ہوتی ہے'' ایسی وضاحتی ضخیم کتاب لکھنا ضروری سمجھتا ہے جس کی زبان کم از کم مخالف کی زبان کو چیلنج کرتی ہو۔ جب یہ دونوں طرف کی کتب بازار میں آکر بازاری بن جاتی ہیں اور اُن کی قیمت لگنا شروع ہوتی ہے تو اس طرح گویا گھر بیٹھے بٹھائے ملازمت مل جاتی ہے۔ صرف ایک سطر کے بدلے پوری امت میں اضطراب و اضطرار اور اختلاف و انتشار پھیلانے کی قیمت وصول کر لی جاتی ہے اور آخرت میں بلا حساب بخشے جانے کی امید اس کے علاوہ ہوتی ہے۔

دشمن نے تو صدیوں سے اربوں ڈالرز خرچ کر کے وہ مقصد حاصل نہ کیا تھا جو اُسے چند ٹکوں کے بدلے، چند دنوں میں مل گیا اور اس طرح ایک خود کار مشین تیار ہوگئی جس کا کام یہ ہے کہ اس کے ذریعے مسلمان کو مشرک، کافر، بدعتی اور گستاخِ رسول ثابت کرنے والے پرزے اور آلات گویا رات دن تیار ہو رہے ہیں۔ اس طرح کافر کو مسلمان بنانے کا عمل ختم ہوا اور مسلمان کو کافر بنانے کا عمل شروع ہو گیا۔

تاریخ کو کھنگالنے کی زحمت گوارہ کی جائے تو نام نہاد مسلم فکر کے پیچھے وہی تحریک کارفرما ہے جس نے قرنِ اوّل ہی سے ایمان کی بنیادوں کو کمزور اور کھوکھلا کرنے کے لیے بہت سوچ و بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا کہ اُن کی تحریک کی بنیاد صرف اس پہ ہوگی کہ:

یہ فاقہ کش جو موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمد (ﷺ) اس کے بدن سے نکال دو![۸]

تحریک منافقین جس کا نام بعد میں تحریک استشراق (Orientalism) رکھا گیا، اُس کا ہر رکن (Worker) چاہے یہودی ہو یا عیسائی، اس کی فکر کج کا رُخ ذاتِ مصطفیٰ کریم ﷺ ہی کی طرف ہے۔ اور اُس کی یہ کوشش ہے کہ ایمان و عمل کی مضبوطی کی بنیاد یعنی محبت و عشق مصطفیٰ ﷺ کو ختم کرنے کے لیے اس ذاتِ پاک کی عظمت و شان کو متنازع، مختلف فیہ بنا کر آپ ﷺ کو عرش کی بلندیوں سے اُتار کر سطح زمین پر لا کھڑا کیا جائے تو محبتیں کم ہو جائیں گی کیونکہ محبت، حسن و جمال، عظمت شان، انفرادیت و امتیاز اور کمالِ صورت و سیرت کی متقاضی ہے۔ جب ان چیزوں کی نفی ہوگی تو محبت بھی شباب کھو بیٹھے گی۔

لیکن مرکز و محورِ ایمان جناب رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس کے استشراقی دشمنوں کو مفکرین اسلام اور غلامانِ رسولِ کریم ﷺ نے ہر رنگ، ہر روپ میں پہچان کر اُن کے خود ساختہ علمی و فکری حجابات کو اتار کر، حقیقی جہالت و سفالت کو خوب واضح کر دیا ہے۔ اور ہنوز اپنا فرض منصبی نبھا رہے ہیں۔

تحریک استشراق نے ہمیشہ مختلف طریقوں سے تنقیص رسالت کے لیے تقریر و تحریر کے

ذریعے اپنے باطنی خبث کا اظہار کیا ہے۔ لیکن اب کچھ عرصہ سے عیسائی تحریک ''شہداء'' جو قرطبہ سے شروع ہوئی تھی[۹] نے ایک نیا رُخ اختیار کیا ہے اور شانِ سیّد الانبیاء ﷺ میں توہین آمیز خاکوں، فلموں اور دوسرے ذرائع سے گستاخی و بے ادبی کر کے پوری امت کو چیلنج کر دیا ہے اور عیسائی حکومتیں اپنے زیر اثر، نفرتوں کی تشہیر کرنے والوں کی وکیل صفائی بن کر آزادئ اظہار کے نام پہ اُن کی ہر طرح سے مدد کر رہی ہیں اور اس طرح دنیا بھر کے امن و امان کو تہہ و بالا اور پائمال کر کے اپنے نیو ورلڈ آرڈر (New Word Order) کی تکمیل میں کوشاں ہیں۔

جبکہ دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے ''ورفعنا لک ذکرک''[۱۰] کے وعدے کی تکمیل کے لیے کائنات بھر میں اپنے محبوب ﷺ کے نام لیواؤں اور غلاموں کو ہزاروں باہمی اختلافات، فرقہ واریت اور بظاہر مذہبی قتل و غارت گری کے باوجود محبت نبی ﷺ کے مضبوط نقطہ پر جمع فرما کر عملاً امت مسلمہ کے ٹوٹے اور بکھرے دلوں کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے جو ایک لحاظ سے فضل خداوندی ہے تو دوسری طرف رسول اللہ ﷺ کا زندہ معجزہ بھی ہے کہ ایک طویل عرصہ سے ایک دوسرے کو گستاخی رسالت کا الزام دینے والے، شرک و بدعت کا طعنہ دینے والے اور باہمی عداوتیں، نفرتیں رکھنے والے کھلم کھلا یہ اعلان کر رہے ہیں کہ گستاخِ رسول چاہے کوئی ہو، اپنا یا بیگانہ، کافر ہو یا بظاہر مسلم، عالم ہو یا جاہل، واجب القتل ہے اور اُس کو قتل کرنے والا مسلمانوں کا ہیرو اور سروں کا تاج ہے۔ اس طرح حالات نے مسلمانوں کو اس نقطہ پر جمع ہونے کا موقع فراہم کیا ہے۔

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے علماء مل بیٹھیں اور باضابطہ اس مرکزی اور مضبوط بنیاد پر ہمیشہ جمع رہنے کے کچھ اصول وضوابط طے کریں، اور ایسے اصول متعین کیے جائیں کہ جن کی روشنی میں، انبیاء کرام علیہم السلام، صحابہ عظام، اہل بیت اطہار اور اولیاء کاملین کے بارے میں کسی بھی گفتگو کو پرکھا جا سکے کہ وہ ادب کے دائرے میں ہے یا ادب سے عاری ہے۔ یہ وقت کا شدید تقاضا اور ضرورت ہے۔ اگر آج ایسا نہ کیا گیا تو یہ بڑی بدقسمتی ہوگی۔ دوسری طرف یہ اصول وضوابط اپنی اپنی حکومتوں سے بھی منظور کرائیں اور حکومتوں کو مجبور کریں کہ وہ ان اصول وضوابط کو اقوام متحدہ سے بھرپور تحریک کے ذریعے تسلیم کرائیں، بصورت دیگر UNO کے اجلاسوں کا بائیکاٹ کریں۔ اس کے ساتھ تمام مکاتب فکر کے علماء کرام یہ فیصلہ کریں کہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں محبت و عشق رسول ﷺ کو ترجیحی بنیادوں پر بیان کریں بلکہ اس سال کو محبت رسول ﷺ کے فروغ کا سال قرار دیں، اور اس طرح اہانت و گستاخی رسالت کے عالمی و مہلک مرض کا علاج بالمحبت کریں۔ اس طریق سے پوری مسلم دنیا میں ایمان و ایقان کی ایک نئی تازہ اور ولولہ انگیز لہر پیدا ہوگی جو کئی غازی علم الدین شہید اور غازی ممتاز حسین قادری پیدا کرے گی جو تحریک استشراق کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دیں گے۔

اتحادِ امت اور اتفاقِ مسلم کا اس سے زیادہ منفرد و ممتاز اور مضبوط و مرکزی نقطۂ اساس نہیں ہو

سکتا جو جذباتیت وولولہ انگیزی سے بھرپور ہو۔

اس کے علاوہ اتحادِ عملی کے لیے جن بنیادی اُمور کی ضرورت ہے اُن کے سلسلے میں چند تجاویز ذیل میں ذکر کی جاتی ہیں۔

اخلاص

یہ بات پہلے بھی عرض کی جا چکی ہے کہ اتفاق ہو یا اختلاف، اگر اُس میں اخلاص کی دولت ہے تو وہ بابرکت، غیر ضار اور باعث رحمت ورأفت ہے۔ اگر اختلاف میں بھی اخلاص کا عنصر (Element) شامل ہو تو وہ یا تو جلد اتفاقی صورت حاصل کر کے ختم ہو جاتا ہے یا کم ہو کر ہمیشہ کے لیے فتنے اور فساد سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اسلاف کے اختلاف کی بے شمار مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ اصل خرابی عدم اخلاص کی وجہ سے جنم لیتی ہے اور لفظوں کا اختلاف دلوں کی نفرت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ حضور انور ﷺ نے فرمایا: ''لا تختلفُوا فتخلف قلُوبکم''[11]

اور دوسری جگہ فرمایا: ''لا تختلفُوا فاِن من قبلکم اختلفُوا فھلکُمْ''[12]

ان احادیث کا مصداق وہ اختلاف ہے جو اختلافِ قلوب کا ذریعہ بن کر ہلاکت و بربادی کا پیش خیمہ ہو۔

معاہدات نبویہ کی اشاعت

اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ بلکہ مشرکین کے ساتھ حضور ﷺ نے منفعت و اشاعت دین کے لیے دُور رس نتائج کے حامل معاہدات فرمائے ہیں اور اُن کا نتیجہ بھی جلد یا بدیر سامنے آیا ہے۔ بوقت معاہدہ بظاہر کڑی شرائط قبول کر لینے پر حضرت عمرؓ جیسے دُور اندیش مخلص صحابی کو بھی اضطراب تھا اور بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ اہل شرک کے ساتھ ''جو معاہدے میں جناب فخر رسالت ﷺ کے نام گرامی کے ساتھ لفظ رسول اللہ (ﷺ) کا لکھنا تک گوارہ نہیں کر سکتے'' اُن کی پسند کی شرائط کے ساتھ معاہدہ کرنا کیسے درست ہو سکتا ہے۔ لیکن بعد میں ثابت ہوا کہ یہی معاہدہ ترویج دین کے سلسلے میں ثابت ہوا۔

اگر ان معاہدات کی اشاعت کو توضیحی اور تشریحی نکات کے ساتھ شائع کیا جائے اور یہ درس دیا جائے کہ جب مشرکین کے ساتھ معاہدات کر کے تلوار کو نیام میں رکھا جا سکتا ہے تو مسلم مکاتب فکر کے مابین مصلحت دین کے لیے معاہدۂ عدم جارحیت (No War Pact) کیوں نہیں ہو سکتا؟ اگر معاہدات نبویہ کو اس انداز سے نصابِ تعلیم میں شامل کیا جائے تو نئی نسل (New Generation) ایسے ماحول میں تربیت پائے گی کہ کچھ ہی عرصے کے بعد حالات میں خود بخود اعتدال روی پیدا ہو جائے گی۔ اس طریق سے سنت نبویہ کا احیاء بھی ہے، تبلیغ و اشاعت دین کا کام جو پوری قوت سے نہیں ہو رہا اُس میں بھی زور پیدا ہوگا اور برکاتِ اسلام ہر سرخ و سفید تک پہنچانے میں بھی آسانی پیدا ہوگی۔

اتفاق کی منظّم کوشش

اگر یہ کہا جائے کہ آج تک کوئی سنجیدہ کوشش اور سعی اتحادِ امت کے لیے نہیں کی گئی تو بجا ہوگا۔ ہمارے ہاں مناظر اہل سنت، مناظر اہل حدیث، مناظر دیوبند اور مناظر اہل تشیع تو پیدا ہوئے ہیں لیکن ایسے لوگوں کے ناموں سے چند سطریں بھی نہیں لکھی جاسکتیں جو مناظر عیسائیت، مناظر یہودیت اور مناظر ہندومت بلکہ جو مصلح امت، داعی تبلیغ دین اور مفکر اسلام کے حاملین حضرات کے ناموں پر مشتمل ہوں۔

اب تک ایسے مناظرے ہو رہے ہیں جن کا مناظرے کے مقاصد کے ساتھ دُور کا بھی تعلق نہیں ہے بلکہ فضول اور بے مقصد مباحث کو جو مجادلہ و مکابرہ (۱۳) کی تعریف کے ذیل میں آتے ہیں، مناظرہ کا نام دے دیا۔ ان مناظرانہ تقریروں اور تحریروں سے اختلاف میں تشدد کی راہ ہموار ہوئی ہے کیونکہ ان مباحث کا مقصد احقاق حق اور ابطالِ باطل ہرگز نہیں ہوتا، صرف فریق مخالف کو لاجواب کرنے کی کوشش ہوتا ہے۔ ایک طرف تو تشہیر اختلاف کی یہ صورت ہے تو دوسری طرف اتفاقِ امت کی باقاعدہ، منظّم اور مخلصانہ کوشش نہیں کی گئی۔ آج تک شاید ہی کوئی ایسی مجلس یا نشست ہوئی ہو جس کا مقصد اتحادِ امت پہ غور کرنا، اختلافات کو اعتدال پر لانا یا اُن کو ختم کرنا ہو۔ یہ بات اعتماد و وثوق سے کی جاسکتی ہے کہ اگر ہر مکتبۂ فکر کے جید علماء اخلاص کے ساتھ مل بیٹھیں اور اتحادِ مکاتب کے موضوع پر غور و خوض فرمائیں، اختلاف میں اعتدال کی راہ تلاش کریں تو یقیناً ایسی سبیل ضرور نکلے گی جو مختلف مسالک فکر کو مشترکات پر جمع کر دے گی اور اختلافات میں بھی خلیج کو ختم کر کے تشدد کے جواز کو بے جواز بنا دے گی۔ اگر اختلاف کو ہوا دینے والے ہزاروں ہوں اور اتفاق کی راہ تلاش کرنے والا کوئی بھی نہ ہو تو بلا چراغ اندھیرے میں چلنے سے جہات مختلف تو ہوسکتی ہیں راہ نوردانِ حقیقت کو کسی ایک جہت پر جمع ہونا نصیب نہیں ہوسکتا۔

کچھ عرصہ پہلے مذہبی منافرت عروج پر تھی۔ مسجد و مدرسہ اور امام بارگاہ سے لے کر گلی کوچے تک اس نفرت کے اثراتِ بد، ہلاکت و بربادی کا باعث بنے ہوئے تھے لیکن اللہ بھلا کرے مولانا شاہ احمد نورانی مرحوم کا جنھوں نے ملی یک جہتی کونسل اور اُس کے بعد متحدہ مجلس عمل کی صورت میں تمام مذہبی و دینی سیاسی جماعتوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے اس مذہبی منافرت و شدتِ اختلاف کو کافی حد تک کم کر دیا تھا۔ اس تجربے سے بھی یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اگر خود علماء اور مذہبی جماعتیں اس مقصد نیک کے لیے کوشاں ہوں تو منزل کو قریب سے قریب تر لاسکتے ہیں۔

حسن ظن

اس بات سے مفر نہیں ہے کہ بہت ساری غیر مسلم ایجنسیاں پاکستان میں بالخصوص اور دیگر مسلم ممالک میں بالعموم قتل و غارت گری اور دہشت گردی کی کارروائیوں میں ملوث پائی گئی ہیں بلکہ پچانوے فیصد (۹۵٪) دہشت گردی کے واقعات میں انہیں خفیہ ہاتھوں کی ہلاکت خیز کارروائی کا تعلق ہوتا ہے

لیکن ذمہ داری مذہبی تنظیموں پر ڈال دی جاتی ہے۔ اگر ایسے موقع پر متاثر فریق عقل وفراست اور صبر و استقامت نیز دُوراندیشی سے کام لے کر ان حوادث کی ذمہ داری غیر مسلم خفیہ ایجنسیوں پر ڈال دے تو تھوڑے ہی عرصے کے بعد مذہبی دہشت گردی کا عفریت اپنی بل میں واپس چلا جائے گا۔ یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ موجودہ دہشت گردی کے پیچھے اُنہیں طاقتوں کا ہاتھ ہے جو بظاہر دہشت گردی کے خلاف مجاہدانہ کردار ادا کرتے ہوئے مجاہدین کو تہہ تیغ کر رہی ہیں۔ بہر حال پاکستانی قوم کو خصوصاً اور پوری امت کو عموماً ایسے نازل مواقع پر کسی بھی مسلم کو موردِ الزام ٹھہرانے کے بجائے اُس کے ساتھ حُسن ظن کا اظہار کرتے ہوئے دشمن کی کارروائی کا رُخ دشمن ہی کی طرف پھیر دینا چاہیے۔

اپنی بات کو حرفِ آخر نہ سمجھا جائے

ہمیشہ اختلاف ظنیات میں ہوتا ہے قطعیات میں نہیں ہوتا۔ اور ظنیات میں کوئی بھی حل یقینی نہیں ہوتا ظنی ہوتا ہے اور اس کی صحت اگر چہ راجح ہوتی ہے لیکن مرجوح جانب کی صحت کا امکان واحتمال بھی ہوتا ہے۔ مجتہد ومُستنبط، خاطی بھی ہوسکتا ہے اور مصیب بھی لیکن اخلاص سے حل مسئلہ میں جد و جہد فرمانے والا کبھی اجر سے محروم نہیں ہوتا جیسا کہ حدیث پاک اس پر شاہد ہے:

''اذا حکم الحاکمُ فاجتھدَ فاصابَ فلہ' اجر انِ و اذا حکم فاجتھدا خطأً فلہ' اجرٌ ثم اخطاء''[۱۴]

ہمارے اکابر یعنی صحابہ کرام علیہم الرضوان اور اُن کے بعد مجتہدین کا طرزِ فکر و عمل یہی رہا ہے کہ وہ اپنی تحقیق کو صحیح اور دوسرے مخالف نقطۂ نظر کو غیر صواب سمجھتے تھے لیکن اپنی تحقیق میں غلطی اور دوسرے مجتہد کی تحقیق میں صحت کے امکان کو بھی رد نہیں فرماتے تھے۔ آج ہم بھی مسلکی اختلافات میں یہی روش اپنائیں تو اعتدال سے کبھی عدول نہیں ہوگا۔ ظنیات میں اپنی تحقیق کو حرفِ آخر سمجھنا، اُسے قطعیات و یقینیات میں داخل کرنے کے مترادف ہے اور یہ راہِ اعتدال نہیں راہِ حق سے عدول ہے۔

دو مختلف نظریات کا قابل قبول ہونا

بعض مسائل میں اختلاف صرف افضلیت واوّلیت پر ہوتا ہے۔ ایسے اختلاف کو شدومد سے بیان کرنے اور صرف اپنے ہی نظریے کو بیان کرنے کے بجائے دونوں نقطہ ہائے نظر کی صحت کو بیان کیا جائے اور افضلیت پر دلائل دینے کے بعد یہ کہہ دیا جائے کہ میری یا میرے اسلاف کی تحقیق یہی ہے ''واللہ ورسولہ اعلم'' تو بہت سارے مسائل اختلافی ہونے کے باوجود کدورتوں کے ماحول سے دُور رہیں گے۔

یہ تو افضلیت کی بات ہے، اگر کسی ایک مسئلہ میں اختلاف ہو اور اُن میں سے صرف ایک ہی نظریہ حقیقتاً صحیح ہو، لیکن جانبین نے اخلاص وللّٰہیت سے اجتہاد کیا ہو تو وہ دونوں نظریے اور اُن پر عمل خود شارع کو قابل قبول ہے۔ غزوۂ احزاب کا واقعہ اس پر گواہ ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا: ''لا یُصلیّن

احدٌ العصرَ إلا فی بنی قریظة''[۱۵] کہ تم میں سے کوئی بھی نمازِ عصر بنو قریظہ تک پہنچنے سے پہلے ہرگز نہ پڑھے۔اب بعض صحابہ کرام علیہم الرضوان نے وقت عصر ہونے پر راستے میں نماز ادا فرمائی اور بعض نے وقت کا خیال نہ رکھا اور بنی قریظہ کے پاس پہنچ کر ہی نماز پڑھی۔اور پھر جب رسول اللہ ﷺ کو علم ہوا تو آپ نے کسی کو بھی نماز دوبارہ پڑھنے کا حکم نہ فرمایا، حالانکہ اُن دونوں میں سے صحیح موقف ایک فریق کا تھا لیکن اُن دونوں نے اخلاص وصفاء قلب سے اجتہاد کیا اور اپنے اس اجتہاد کو درست سمجھتے ہوئے اس پر عمل کیا تو دونوں کا عمل قبول فرمایا گیا۔اس کا معنٰی یہ ہے کہ جب دو مجتہد کسی مسئلہ میں اجتہاد کرتے ہیں اُن میں سے ایک صواب پر دوسرا خطاً پر ہوتا ہے۔تو صواب پر ہونے والے کو دوگنا ثواب ملتا ہے اور خطاً پر ہونے والے کو صرف ایک نیکی کا ثواب ہوتا ہے۔لیکن اس جگہ وضاحت طلب امر یہ ہے کہ جو خاطی ہے اور اپنی خطاً پر مطلع نہیں ہوا، ساری زندگی اُس پر عمل پیرا رہا اُس کی اشاعت کی اور اُس کے متبعین بھی اُسی پر عمل کرتے رہے تو کیا قیامت کو وہ زیر عتاب وعقاب ہوگا؟ اُس کا عمل مردود ہوگا؟ کیا اُسے اس وجہ سے جہنم رسید کیا جائے گا؟ کیا اُس سے اس پر مؤاخذہ ہوگا؟ اس حدیث پاک اور دوسری احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُس خاطی اور متبعین کا عمل قابل قبول ہوگا جس نے اخلاص سے اجتہاد کیا۔بزعم خود اُس کا اجتہاد درست تھا لیکن حقیقت میں درست نہ تھا، اگرچہ افضلیت واولویت دوسرے فریق کو حاصل ہوگی لیکن عمل اس کا بھی رائیگاں نہ جائے گا۔

جب اللہ جل شانہٗ کی طرف سے یہ حکم ہے تو ہمارے پیشوایان کو بھی یہ طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے اور قبولیت ومردودیت کا الٰہی حق تسلیم کرتے ہوئے اسے خود استعمال کرنے کی جسارت نہیں کرنی چاہیے۔اس سے اتحاد واتفاق کا راستہ ہموار کرنے میں یقیناً مدد ملے گی۔

انتخاب الفاظ

تقریر ہو یا تحریر ہمیں محتاط، منتخب، سنجیدہ اور متین الفاظ کے استعمال کو یقینی بنانا چاہیے کیونکہ اچھے یا بُرے اثرات الفاظ سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔اور پھر بات کرنے کا لہجہ اور انداز بھی اس میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔تصنیف وتالیف اور تقریر وبیان میں چبھتے، نوکیلے، غصیلے اور زہر آلود الفاظ نے ہی ماحول میں بے چینی پیدا کی ہے۔مسلکی اختلافات کی پرورش، اٹھان اور تلخی انہیں سیف اثر الفاظ، نازیبا طرزِ تکلم اور شعلہ لسانی کا نتیجہ ہے۔میدان مناظرہ میں ''**ھل من مبارز**''؟ کی صدا ماحول کو گرم رکھنے میں اپنا منطقی کردار ادا کرتی ہے۔کون باخبر اس سے بے خبر ہے کہ ''**جراحاتُ السنانِ لها التیام: ولا یلتامُ ما جرحَ اللسانُ**''[۱۶] اس لیے ذمہ دار حضرات جن کی گفتگو ماحول میں ذرا سی بھی تبدیلی لاسکتی ہے، تقریر وتحریر میں جملوں کی نوک پلک سنوار کے کلام کو ایک عروسہ کی شکل میں سامعین کے سامنے پیش کریں تاکہ میٹھی گفتگو بھی سینے میں تیر بن کر نہ چبھے بلکہ کڑوی اور تلخ حقیقت بھی شِیر (دودھ) بن کر باطن میں اُتر کر

دل و دماغ کو مثبت انداز میں متاثر کرے۔

متنازع عبارات کا حذف

اگر پوری دیانتداری اور گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ چند عبارات ایسی ہیں جن کی وجہ سے مسالک میں کشیدگی اور کشمکش پائی جاتی ہے اور انہیں غیر محتاط عبارات کے اختلاف کی وجہ سے دوسرے اختلافی مسائل میں بھی شدت آ گئی ہے۔ ان عبارات کے لکھاری (Writers) اور اُن کے پیروکار (Followers) انہیں بنیادِ اسلام کا درجہ دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ان کو حذف کر دیا گیا تو قصر دین دھڑام سے گر جائے گا اور تبدیل کرنے سے بھی گویا اسلام کی عمارت کھوکھلی سی لگے گی جبکہ دوسرا فریق ان کو کفر تمام کہتا ہے۔ طرفہ ظلم یہ ہے کہ ان عبارات کو جو چند سطروں پر مشتمل ہیں، حذف کرنا گوارہ نہیں کیا گیا اور اس کی تاویل میں کئی ضخیم کتب امت کے اتحاد سے کھیلنے کے لیے میدان میں اُتار دی گئی ہیں۔

اور اگر ان عبارات مختلفہ کو دیکھا جائے تو ان کی زد میں کوئی عام انسان، عالم، فقیہ اور مجتہد نہیں انبیاء کرام بلکہ امام الانبیاء علیہم السلام تک آتے ہیں۔ کوئی غیر جانبدار بھی ان عبارات کو پڑھے تو اُس کا کلیجہ منہ کو آئے گا کہ ایک طرف تو ان ذواتِ قدسیہ پر مر مٹنے کی قسمیں کھائی جاتی ہیں، ناموس کے تحفظ کی تحریکیں چلائی جاتی ہیں، جن کی ہلکی سی بے ادبی کو بدترین کفر اور بے ادب کو ناقابل معافی مجرم قرار دیا جاتا ہے مگر دوسری طرف اپنے ہی بزرگوں سے سرزد ہونے والے غیر محتاط الفاظ کو قرآن کا درجہ دے کر بہر صورت ہو بہو رکھنے اور اُنہیں صدقِ کُل ثابت کرنے کے لیے ہر طرح کی قیمت ادا کرنے کا عزم صمیم کیا جاتا ہے۔ اور اس طرح ایک طرف اپنے نبی کو ایک عامی انسان تو دوسری طرف اس عبارت کے موجد کو منصب نبوت کے برابر لا کھڑا کیا جاتا ہے۔ یہ کس قدر افسوس ناک پہلو ہے۔

اس لیے اگر اِن چند عباراتِ مختلفہ کو کتب سے نکال دیا جائے تو جہاں ان نفوس طیبہ کے ساتھ ایمانی وابستگی مضبوط ہوگی وہاں اس کی برکت سے اتحادِ امت کی راہ بھی ہموار ہوگی۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ان عبارات مختلفہ قبیحہ کو حذف کر کے یہ ثابت کیا جائے کہ ہم کسی شخصیت کو اس کی علمیت اور دنیوی یا خونی رشتے کی بنیاد پر نہیں مانتے۔ ہم کسی کو صرف اُسی صورت میں مانتے ہیں کہ جب وہ منصب رسالت و نبوت اور مقام محبوبیت الٰہیہ کے ادب و احترام، تعظیم و توقیر اور تحریم و تکریم کے ہر تقاضے کو پورا کرنا اپنے ایمان کی روح (Spirit) سمجھتا ہو۔

بالمشافہ بحث

کوئی ایسی بات جو کسی تصنیف، تالیف یا خطبے میں آ جائے اور دوسرے صاحب علم و دانش کے نزدیک درست نہ ہو تو اس کا صرف یہ حل نہیں ہے کہ اُس کے خلاف اسی جیسی کتاب لکھ کر منظر عام پر لائی جائے یا اُسی جیسا عوامی اجتماع کر کے اُس کا جواب شعلہ لسانی سے دیا جائے۔ اس سے کبھی بھی نظریات کو

درست سمت نہیں ملی اور نہ مل سکتی ہے۔ یہ طریقہ اصلاحی نہیں، فسادی ہے۔ ایسے طریقے سے کوئی آج تک کسی کو قائل نہیں کر سکا۔

اس صورت حال کا مفید اور مثبت طریقہ یہ ہے کہ جس صاحب سے اختلاف ہے اس سے بالمشافہ اور انفرادی (One to One) ملاقات کر کے مختلف فیہا مسئلہ پر تبادلہ دلائل کیا جائے اور زبان محبت کی استعمال کی جائے، الفاظ کو سنجیدہ رکھا جائے اور دلائل کا اخلاص و دیانتداری سے جائزہ لیا جائے اور جو حل حقیقت پر مبنی ہو اُس کو خندہ جبین سے قبول کرنے میں عار نہ محسوس کی جائے۔ اگر ایک ملاقات میں کسی نتیجہ پر پہنچنا مشکل ہو تو یہ ملاقاتوں کا سلسلہ اُس وقت تک جاری رکھا جائے جب تک کسی نقطہ پر اتفاق نہ ہو جائے۔ لیکن یہ ساری کوشش حق کو پانے کی ہو صرف دوسرے کو منانے کی نہ ہو۔

اس دوران کسی دوسرے فرد کو مطلع کرنا، بحث کو ریکارڈ کرنا، اپنی فوقیت اور دوسرے کے ضعف کا اعلان کرنا، یہ ساری چیزیں عدم اخلاص، بددیانتی اور محض اپنی شہرت کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا مفہوم نہیں رکھتیں۔ اس لیے ان امور سے بچ کر صرف اللہ تعالیٰ اور اُس کے کراماً کاتبین کے ریکارڈ پر بھروسہ کرتے ہوئے، اپنی جدوجہد کو جاری رکھنا ہی دارین میں حصولِ سعادت کا ذریعہ سمجھا جائے۔

فریق مخالف کے نظریے کی تحقیق

سنی سنائی بات پر اختلاف کی بنیاد رکھنا ظلم اور حق سے بغاوت کے مترادف ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''کسی آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے اتنا کافی ہے کہ وہ ہر سُنی سنائی بات کو (بلاتحقیق آگے) بیان کردے۔''[۱۷] ہمارے ہاں بہت سارے اختلافات کی بنیاد ایسے مسائل پر ہے جن کی کوئی بنیاد ہی نہیں ہے۔ ظلم کی انتہا تو یہ ہے کہ آج کل موبائل ایس ایم ایس (SMS) کے ذریعے ایسے ایسے شوشے چھوڑے جاتے ہیں کہ اُن کا حقیقت سے نہ قریب کا تعلق ہوتا ہے نہ دُور کا۔

اگر ایسے ذرائع سے ملنے والی خبروں پر اعتماد ہو تو پھر اختلاف کے سوا معاشرے میں کیا بچے گا۔ اس لیے اگر اختلافی نظریات کا پوری دیانتداری سے جائزہ لیا جائے تو اختلافی مسائل کی فہرست میں اختصار آ سکتا ہے۔ لیکن نفسانیت و ہوائے نفس تو صرف دوسرے مسلک سے عوام کو متنفر کرنے کے عمل کو ایسا مزین و آراستہ کر کے پیش کرتی ہے کہ حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔ اشاعت نفرت کے لیے کذب بیانی کو بھی جواز کے فتوے تحفظ فراہم کرتے ہوں تو اس عمل کو نہ معلوم کس چیز کا نام دیا جائے گا لیکن بہر حال عملاً ایسا ہی ہو رہا ہے۔

کسی مسلک کا مختلف فیہا مسئلہ

کبھی ایک مسئلہ کسی مسلک کے علماء میں ہی مختلف فیہا اور متنازعہ ہوتا ہے تو اسے فریق مخالف پورے مسلک کی طرف منسوب نہ کرے بلکہ اسے صرف اسی عالم کا نظریہ قرار دے جس نے اُسے پیش کیا

ہے۔اس طرح کرنے سے کئی مسائل سے اختلاف کا حجاب اُٹھ جائے گا۔مثلاً اہل اللہ کی قبور کو بوسہ دینا اہل سنت بریلوی کے علماء میں ہی مختلف فیہا ہے۔بعض اس کے جواز کے قائل ہیں اور بعض عدم جواز کے۔ (۱۸)

ایسے ہی دیو بند مکتبہ فکر کے علماء میں بعض بعداز وصال حیات النبی ﷺ کے قائل ہیں اور بعض مخالف۔قائلین کو حیاتی اور منکرین کو مماتی کہا جاتا ہے۔

الزام کے عدم قبول کی صورت میں محتاط رویے کی ضرورت

اگر ایک مسلک کوئی الزام قبول نہ کرے تو دوسرا بہر صورت اُس کے سر تھوپنے کی کوشش نہ کرے۔اس سے آہستہ آہستہ اختلافی مسئلہ ختم ہو جاتا ہے اور اگر الزام کو زبردستی ثابت کرنے کی کوشش جاری رکھی جائے تو دوسرا فریق بھی مجبوراً اُسے قبول کر کے جواب دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔اس طرح خواہ مخواہ فتنہ وفساد کا دروازہ کھل جاتا ہے۔یہاں پر ایک شبہ سر اُٹھا سکتا ہے کہ ایک بات کسی مکتبۂ فکر کے بانی مفکرین کی کتب میں موجود ہوتی ہے لیکن اُس کے متبعین اُس کی تاویلات کرتے ہیں اور اُس سے ظاہراً اخذ ہونے والے مفہوم کو اپنا نظریہ قرار نہیں دیتے،تو اس کا کیا کیا جائے؟

اس کا سیدھا سادہ حل یہ ہے کہ ایسی صورت میں اُس کا معنیٰ یہ سمجھ لیا جائے کہ اس مکتبۂ فکر نے متنازع نظریہ یا عبارت سے رجوع کر لیا ہے۔اگرچہ رجوع کی کئی صورتیں ہیں جن کی تقسیم مسئلہ اور اُس کے اظہار کی نوعیت کو سامنے رکھ کر کی جاتی ہے''الضرورات تبیح المحظوراتِ''(۱۹) کے پیش نظر اس عملی صورت کو قبول کر کے اتحادِ امت کے وسیع تر مفاد کے اہم مقصد کے حصول کو قریب تر کر دیا جائے تو یہ عمل بہت ہی مناسب ہوگا۔اور اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ یہ نظریہ پورے مسلک کا نمائندہ نہیں ہے (تبھی تو اس کی تاویلات اور انکار کا راستہ اپنایا گیا ہے) تو بھی اختلاف کا دائرہ محدود ہو سکتا ہے۔لیکن بہتر طریقہ بہر حال یہی ہے کہ تحریراً ایسے نظریے سے برأت کا اظہار کر دیا جائے یا وہ مقامِ متنازع اصل کتاب کے بعد بریکٹ میں یہ لکھ دیا جائے کہ یہ عبارت مصنف کی طرف منسوب ہے اور متنازعہ ہے جسے اُس کے پیروکاروں یا متاخرین نے قبول نہیں کیا اس لیے اس جگہ یہ ترمیم کی جاتی ہے اور اس کے بعد صحیح عبارت لکھ کر اختلاف کو''کفنا دفنا'' دیا جائے۔یہ وقت کی سخت ضرورت ہے۔

جہلاء کے عمل کو مسلک کا نام نہ دیا جائے

کسی بھی مسلک کی کمزوریوں کو تلاش کرنے کی تگ ودو میں رہنا تا کہ مخالفت کی آگ کو روشن کر کے پوری امت کو اس میں جھلسایا جائے،اس کے لیے جہلاء کے عمل کو بھی بنیاد بنا کر فریق مخالف کو بھرے مجمع میں للکارنا اور اپنی تصانیف میں اس پر زہریلے جملے کسنا،حق کا خون بھی ہے اور فساد وفتنہ کی اشاعت کا جنون بھی۔جہلاء تو کالانعام ہوتے ہیں چاہے جس بھی مسلک سے ہوں۔اُن کا کوئی بھی

مسلک نہیں ہوتا، یہ لامسلک ہوتے ہیں بلکہ جہالت ہی اِن کا مسلک ہوتا ہے۔ اس لیے جہلاء کے کسی عمل کو بنیاد بنا کر اپنی پیاس بجھانا نہیں چاہیے۔

اس عملی بے رہروی کا الزام کسی دوسرے مسلک پر لگا کر خود بے راہرو ہونے کے بجائے عوام کا اعتقادی و عملی قبلہ صحیح کرنے کی مخلصانہ سعی کرنی چاہیے اور اُنہیں یہ بتانا چاہیے کہ اُن کا یہ عمل اُس عقیدہ میں بھی درست نہیں جس کے ساتھ اُنہیں وابستگی کا دعویٰ ہے۔ لیکن ہمارے ماحول میں واعظین ''جو ہر طبقۂ فکر میں ہوتے ہیں'' زبردستی جہالت کو مسلک کا حصہ بنا کر ایک طرف تو دیانت کا خون کرتے ہیں دوسری طرف ایک اور اختلاف کا اختلافی فہرست میں اضافہ کرتے ہیں۔ یہ اخلاص نہیں فکر کا افلاس ہے۔

عبادت گاہوں کا احترام

شریعت اسلامیہ میں حالت جنگ و حرب میں بھی عمارات کو گرانا اور گرجوں میں موجود ایسے غیر مسلموں کو قتل کرنے سے منع کیا گیا ہے جو عملاً جنگ میں شریک نہیں ہیں۔ ایسے ہی بچوں، معذوروں اور عورتوں کو قتل کرنے سے روکا گیا ہے۔[۲۰] تو سوال یہ ہے کہ حالت امن میں جنگ سے بھی زیادہ سخت اور خطرناک اقدام کرتے ہوئے مساجد و امام بارگاہوں اور اہل اللہ کے مزارات وغیرہ کو گرانا جائز ہے؟ کیا یہ اسلامی تعلیمات کی مخالفت اور انتشار و افتراق کا باعث نہیں ہے؟ کیا اس پر ثواب ہے یا ہوگا! قرآن حکیم میں مساجد کے نظام عبادت میں خلل ڈالنا ظلم عظیم قرار دیا گیا ہے:

''و من اظلمُ ممن منع مساجدَ اللّٰہ ان یذکرَ فیھا اسمُہ و سعی فی خرابِھا''[۲۱]

لیکن نظریاتی و مذہبی اختلاف کو بنیاد بنا کر قتل و غارت گری، مساجد و امام بارگاہوں کا انہدام، عوامی عمارات کو نقصان پہنچانا اور ساتھ ساتھ ایسے افراد کا قتل جو عبادتِ الٰہی میں مصروف ہوں کس قدر بُرا اور قابل مذمت ہے۔ اگرچہ ایسی کارروائیاں اکثر ہمارا دشمن ہی کرتا ہے لیکن اس کو اس کی بنیاد ہم خود فراہم کرتے ہیں اور راستہ بھی ہم خود صاف کرتے ہیں۔ اسلامی تعلیمات دیکھیے کہ حالت جنگ میں بھی غیر مسلم کے بچوں، عورتوں، بوڑھوں اور مذہبی راہنماؤں کو قتل کرنا ممنوع و مذموم ہے۔ دوسری طرف مسلمان ملک میں مسلمانوں کی عبادت گاہوں میں بچے، بوڑھے اور مذہبی راہنما اور نمازی قتل ہوجاتے ہیں، یہ کس قدر باعث تشویش ہے؟ کیا کوئی مسلمان ایسا کرسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

تبادلۂ تحائف و نجی ملاقاتوں کا اہتمام

مختلف مسالک کے علماء باہم ملاقات اور سلام و دعا کو بھی ناجائز سمجھتے ہیں۔ اپنی خوشی و غمی کی تقریبات میں کسی دنیادار، راشی اور سود خور کو تو بلا لیتے ہیں لیکن پڑوس میں اگر دوسرے مکتبۂ فکر کا کوئی عالم دین رہتا ہو تو اُسے بلانا اپنے مسلک سے غداری کے مترادف خیال کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی بلانے کی

جسارت کر لے تو دوسرا فریق شرکت کو شرک کے مساوی سمجھ کر نہ جانا ہی باعث تقویت ایمان گردانتا ہے جبکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تبادلۂ تحائف سے محبت ومودت میں اضافہ ہوتا ہے اور بہت سے اختلافات ختم ہوتے ہیں، اتفاق بڑھتا ہے۔

انٹرنیٹ (Inter Net) کا میدان جنگ

آج کل انٹرنیٹ کا استعمال بھی اختلافات کو ہوا دینے کے لیے اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔ ہر مسلک دوسرے مسالک کے خلاف ایسے کلپز (Clips) دکھا رہا ہے کہ ایک طرف غیر مسلم، اسلام سے مزید متنفر ہو رہے ہیں اور دوسری طرف خود مسلمان تمام مسالک، مذہب، دین، علماء اور دینی مراکز کے بارے متزلزل ہو رہے ہیں۔ اس عمل سے مسلمانوں کی کیا اصلاح ہوگی، الٹا اسلام ایک کھیل اور مزاح بن کر رہ گیا ہے۔ غیر مسلم کو اسلام پر اعتراضات کرنے اور بدنام کرنے کا بہترین موقع مل گیا ہے۔ اس سے ترویج دین کے نام پر تخریب دین کے نہایت گھناؤنے اور شرم ناک فعل کا مسلسل ارتکاب ہو رہا ہے۔ اسلام دوستی کے نام پر اسلام دشمنی ہو رہی ہے۔ ہر گھر میں اسلام دشمنی کی تحریک کے اثراتِ بد ہمارے اپنے عمل سے پھیل رہے ہیں۔ ایک سازش کے تحت پہلے ہی علماء اور عوام کے درمیان دیوار حائل کر دی گئی ہے۔ جو کسر باقی رہ گئی تھی وہ انہیں علماء کے ناعاقبت اندیش اور نادان پیروکار پوری کر رہے ہیں۔

اس لیے تمام مکاتب فکر کو مل بیٹھ کر اپنے اپنے مسالک کو بچانے کی فکر کے بجائے پورے اسلام کو بدنام ہونے سے بچانے کی فوری تدبیر کرنی چاہیے اور اس کے لیے ضابطۂ اخلاق وضع کرنا چاہیے۔

لادین عناصر کی سازش کا ادراک

دشمنانِ اسلام ہمیشہ سے اسلام کو کمزور کرنے کے لیے مختلف سازشیں کرتے رہے ہیں۔ ممالک اسلامیہ کو لڑانا، باہمی اختلافات کو ہوا دینا، خود قتل و غارت گری کر کے مذہبی جماعتوں کے سر تھوپنا اور اختلافی مسائل کو بیہودہ اور اشتعال انگیز الفاظ میں بیان کر کے فرضی ناموں سے شائع کرانا وغیرہ ان کے طریقے رہے ہیں۔ اس لیے مذہبی راہنماؤں کو ان عناصر کی تخریبی کارروائیوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ ذیل کا اقتباس خلاصۃً پڑھیے اور اندازہ کیجئے کہ دشمن کیسے منظم طریقے سے سازش کرتا ہے۔

> ”برنسکی نے ۳ جولائی ۱۹۷۹ء کو انکشاف کیا کہ جمی کارٹر نے اس مقصد (انتہا پسند رجحانات کو فروغ دینا) کے لیے پانچ صد (۵۰۰) ملین ڈالرز کا ایک خفیہ فنڈ منظور کیا اور اسے کانگریس سے بھی خفیہ رکھا گیا اور جان پلکر کے بقول اس فنڈ کا مقصد ایک ایسی عالمی دہشت گرد تحریک کا قیام عمل میں لانا تھا جو وسط ایشیا میں روسی حکومت کو ختم کرنے کے لیے اسلامی بنیاد پرستی کو فروغ دے۔“(۲۲)

اس سازش سے جو عقدے حل ہوئے ہیں، اس پر تبصرے کی ضرورت نہیں ہے۔ دہشت گردی

کے لیے بنیاد پرستی اور انتہا پسندی کو فروغ دینا، پھر اُس کے ذریعے دوہرے فوائد حاصل کرنا، مسلمانوں کو مسلمانوں سے مروانا، اپنے ایک دشمن کو دوسرے دشمن سے مروانا اور پھر اسی لڑائی کے بہانے دونوں کو مارنا وغیرہ۔ یہ سب کچھ پوری دنیا میں امریکہ اور اُس کے اتحادی کر رہے ہیں لیکن افسوس ہے کہ ہمارے بعض ناعاقبت اندیش مفکرین انہیں کی ڈوری پہ ناچتے ہیں اور اپنے ہی خلاف پراپیگنڈہ شروع کر دیتے ہیں جس سے اس چالاک دشمن کو مزید کارروائی کا بہانہ مل جاتا ہے۔ اس لیے ان سازشوں کا گہری نظر سے ادراک کرنا چاہیے۔

حکومتی پالیسی میں ترمیم کی ضرورت

جن اسلامی ممالک میں مساجد، مدارس یا مذہبی راہنماؤں پر حملے ہو رہے ہیں اُن میں عموماً مجرم پکڑے نہیں جاتے کیونکہ پولیس کو ان مجرموں کے سرپرستوں سے اپنی جان اور ملازمت کا خطرہ ہوتا ہے لیکن بعض کارروائیوں میں کچھ دہشت گردی کے مرتکب گرفتار ہو بھی جاتے ہیں اور ایسی صورتِ حال میں بھی نہ تو اُن کے کوائف سے عوام کو باخبر رکھا جاتا ہے اور نہ ہی اُن سے متعلقہ کارروائی سامنے لائی جاتی ہے، تاکہ اصل حقائق سامنے آئیں اور سب کو علم ہو کہ یہ لوگ کون تھے، ان کے پیچھے کون تھا اور کارروائی کے مقاصد کیا تھے؟ کتنے واقعات میں مذہبی عناصر ملوث تھے اور کتنے واقعات کے پیچھے ملک دشمن غیر ملکی ایجنسیاں خفیہ طور پر مکروہ مقاصد کے حصول میں سرگرم تھیں۔ اگر کسی مذہبی مقام یا شخصیت پر کوئی حملہ ہو جائے تو اُسے فرقہ واریت کے عفریت کا حملہ قرار دے کر دینی و مذہبی جماعتوں کے خلاف زہریلا پراپیگنڈہ شروع کر دیا جاتا ہے تاکہ اصل طاقت کے چہرے سے حجابِ ظلم نہ اترنے پائے۔

اس لیے حکومت کو چاہیے کہ جب کسی ایسی ناپسندیدہ کارروائی میں مجرم گرفتار ہوں تو اُن کے خلاف ہونے والی ساری تحقیق کو منظر عام پر لایا جائے تاکہ عوام کو بھی پتہ چل سکے کہ کتنے واقعات میں مذہبی جنونی افراد ملوث ہیں اور کتنے واقعات میں کوئی اور طاقت اپنا ظالمانہ کھیل کھیل رہی ہے۔ اگر ایسی پالیسی (Policy) اختیار کی جائے تو یقیناً بہت کم واقعات مذہبی دہشت گردی اور تفرقہ بازی کا نتیجہ ہوں گے۔ اس طرح بہت ساری غلط فہمیاں ختم ہوں گی اور اتحادِ امت کا خواب تعبیر سے شرمندہ ہونے لگے گا۔

ذرائع ابلاغ کی اصلاح کی ضرورت

جب بھی کوئی دہشت گردی کا واقعہ ہو جائے تو خصوصاً ہمارے ملک کے تمام ذرائع ابلاغ، سربراہانِ ذرائع اور مغربی فکر کے حامل تبصرہ نگار اسے فرقہ واریت، مذہبی انتہا پسندی اور مسالک کی باہمی کشمکش کا نتیجہ قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ طرزِ تبصرہ بجائے خود انتہا پسندی، مذہب سے دشمنی، اختلافات کو ہوا دینے اور بلاتحقیق کوئی نتیجہ بیان کرنے کی مذموم حرکت ہوتی ہے۔ جب تک کوئی تحقیقی اور حتمی نتیجہ سامنے نہ آئے کسی بھی واقعے کو نہ ذاتی عداوت کہا جا سکتا ہے نہ سیاسی دشمنی کا نتیجہ اور نہ ہی مذہبی انتہا پسندی کی

کارروائی۔

ایسے تبصروں سے اصل دشمن چھپ جاتے ہیں۔ پولیس انتظامیہ غلط بنیادوں پر تحقیق شروع کر دیتی ہے۔ حقیقی دشمن، انتظامیہ کی ناک کے نیچے ناک چڑھاتا رہتا ہے اور یہ مساجد و مدارس دینیہ کے اردگرد مذہبی دہشت گردی کی بُو سونگھنے میں لگی رہتی ہے۔اس طرح دینی حلقوں کے گرد دائرہ تنگ کر کے پوری دنیا کو یہ پیغام (Message) دیا جاتا ہے کہ ہمارے ہاں ہر مسجد، ہر دینی ادارہ اور ہر مذہبی راہنما دہشت گرد،ایک دوسرے کے خون کا پیاسا اور اتحاد کا دشمن ہے،اس طرح کے عمل سے مزید ایسی کارروائیوں کے بہت سارے دروازے کھل جاتے ہیں۔اس لیے ہمارے میڈیا(Media) کو ذمہ داری کا احساس کرنا چاہیے اور ایسے مبصرین کی حوصلہ شکنی کرنی چاہیے جو اتحاد کی راہ ہموار کرنے کے بجائے اُسے مزید پیچیدہ کررہے ہیں۔

نشرواشاعت کمیٹیوں کا قیام

ہر مکتبۂ فکر میں بہت سارے آزاد مصنّفین اور غیر ذمہ دار لکھاری آئے دن پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کی تصانیف ہی زیادہ تر اختلافات کا ذریعہ بنتی ہیں۔ جب ایک غیر تحقیقی، قابل اعتراض اور غیر سنجیدہ تصنیف اور پھر اُس کا جواب بھی بازار میں آجائے تو اُس کو ختم کرنا بہت ہی مشکل ہوجاتا ہے۔

اس کا حل صرف یہ ہے کہ ہر مسلک کی ایک مستند علماء پر مشتمل کمیٹی بن جائے جو پورے مسلک کی نمائندہ ہو اور اس کی ذمہ داری ہو کہ وہ اپنے مسلک کی چھپنے والی ہر کتاب کا بغور جائزہ لے۔اگر یہ کتاب اُس مسلک کی صحیح نمائندگی کرتی ہو،سنجیدہ اور محتاط عبارات سے مزین ہو تو اُس کمیٹی کے تحریری اجازت نامے سے اُسے منظرعام پر لایا جائے بصورت دیگر حکومت کسی بھی کتاب کے چھپنے پر مکمل پابندی عائد کردے۔اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ایک طرف تو اختلافات کی سطح کم ہوگی دوسری طرف معیاری کتب ہی زیورِطبع سے آراستہ ہوں گی۔غیر معیاری کتب کا خاتمہ ہوگا اور تحقیق وجستجو کا راستہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جائے گا۔

تمام مسالک کی نمائندہ کمیٹی کا قیام

ہر مسلک کی نمائندہ کمیٹی سے دو دو ارکان لے کر ایک مشترکہ کمیٹی تشکیل دی جائے جس کا کام اختلافی مسائل پر تبادلہ خیالات کرنا اور اتفاق رائے سے راہِ اعتدال کی تلاش ہو۔اگر کوئی نقطۂ اتحاد پیدا ہو جائے یا ایسی صورت جو اتحاد کے قریب ہو اور اُس کی بناء پر مزید اختلاف نہ ہوسکتا ہو نیز اُس میں شدت و تلخی نہ ہو تو اُسے متفقہ فیصلے سے شائع کردیا جائے ورنہ اپنی بحث کو خفیہ رکھتے ہوئے مزید غور وخوض جاری رکھا جائے تاوقتیکہ کوئی مناسب صورت پیدا ہوجائے۔عوام کو صرف کمیٹی کے متفقہ فیصلوں سے ہی آگاہ کیا جائے اور اندرونی کارروائی کو تقریراً تحریراً اشارۃً یا کنایۃً کسی جگہ ظاہر نہ کیا جائے۔

کھلے عام مناظروں پر پابندی لگادی جائے۔صرف بند کمرے میں اور مشترکہ کمیٹی کے سامنے اپنے خیالات و دلائل کا تبادلہ کریں اور پھر کمیٹی اگر مناسب سمجھے تو ان دلائل کا جائزہ لے کر معتدل فیصلہ، جو بہر حال حق پر مبنی ہو، صادر فرما کر اُس کی اشاعت کی اجازت دے۔لیکن یہ صرف اُس صورت میں ہو کہ جب تمام ارکان اس پر متفق ہوں۔

حوالہ جات وحواشی

۱۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، باب بدؤالوحی الی رسول اللہ ﷺ، رقم الحدیث ۱

۲۔ الحاکم، محمد بن عبداللہ، المستدرک علی الصحیحین، دارالکتب العلمیہ، بیروت، سن، کتاب العلم، ۱/ ۱۷۷

۳۔ مسلم بن الحجاج القشیری، صحیح مسلم بشرح النووی، کتاب الفضائل، **باب بیان أن بقاء النبی ﷺ امان لاصحابه، فبقأ اصحابه امان للأمة**، رقم ۶۴۶۶، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، س ن

۴۔ سورۃ العلق ۹۶: ۱، ۵

۵۔ آل عمران ۳: ۱۰۳

۶۔ ایضاً

۷۔ مسلم بن الحجاج القشیری، صحیح مسلم بشرح النووی، کتاب الفضائل، باب مواخاۃ النبی ﷺ بین اصحابہ، ۳۱۲/۲، رقم ۶۴۶۳

ابن ہشام، ابو محمد عبدالملک، السیرۃ النبویۃ مع الروض الانف، عبدالتواب اکیڈمی، ملتان، س ن، ص ۱۸

السہیلی، ابوالقاسم، عبدالرحمٰن بن عبداللہ، الروض الانف، عبدالتواب اکیڈمی، ملتان، س ن، ۱۸/۲

۸۔ محمد اقبال، ڈاکٹر، ضرب کلیم، مشمولہ: کلیات اقبال، الفیصل ناشران وتاجران کتب، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۱۲۴

۹۔ کیرن آرمسٹرانگ، محمد ﷺ اے بائیوگرافی آف دی پرافٹ، مترجم: نعیم اللہ ملک، لاہور: ۲۰۱۲ء، ص ۳۵ تا ۴۱

۱۰۔ الانشراح: ۴

۱۱۔ بخاری، التاریخ الصغیر، نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۹۶۱ء، ج ۲، ص ۴۹۴

۱۲۔ بخاری، صحیح بخاری، کتاب ابواب الفضائل القرآن، باب اقرؤا القرآن ما ائتلفت قلوبکم، رقم ۵۰۶۲

۱۳۔ عبدالرشید بن محمد مصطفیٰ، مناظرہ رشیدیہ، دارالحدیث ملتان، س ن، ص ۱۲، ۱۳

۱۴۔ بخاری، صحیح بخاری، کتاب الاعتصام، باب اجر الحاکم اذا جتهد ......رقم ۷۳۵۲

۱۵۔ بخاری، صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب مرجع النبی ﷺ من الاحزاب، رقم ۴۱۱۹

۱۶۔ جامی، عبدالرحمٰن بن نظام الدین، شرح الجامی علی الکافیہ، نعمانی کتب خانہ، کابل افغانستان، س ن، ص ۱۹

۱۷۔ مسلم، صحیح مسلم، مقدمہ، ص ۸، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، سن ندارد ص ۸

۱۸۔ اعلیٰ حضرت احمد رضا خان، فتاویٰ رضویہ، رضا فاؤنڈیشن، لاہور، ج ۲، ص ۵۲۶ تا ۵۲۸

۱۹۔ ابن نجیم، زین الدین بن ابراہیم، الاشباہ والنظائر، قدیمی کتب خانہ کراچی، س ن، ص ۸۷

سیوطی، عبدالرحمٰن بن ابی بکر، الاشباہ والنظائر، دارالتوفیقیہ للتراث، القاہرہ، س ن، ص ۱۱۶

۲۰۔ ابن حزم، علی بن محمد، الاحکام فی اصول الاحکام، دارالآفاق الجدیدہ، بیروت، س ن، ۲/ ۶۶

ابوداؤد، سلیمان بن اشعث، سنن ابی داؤد، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، باب فی قتل النسآء، رقم ۳۶۶۸

ابن ماجہ، محمد بن یزید، سنن ابن ماجہ، باب الفارات والبینات، بیت الافکار الدولۃ، بیروت، س ن، رقم ۲۸۴۱

۲۱۔ البقرہ ۲: ۱۱۴

۲۲۔ ہمایوں عباس، ڈاکٹر، مذہبی انتہاپسندی اور اُس کا تدارک، مکتبہ جمال کرم، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۲۱